نظرات

جب کبھی کوئی ایسا مسئلہ مسلمانوں کے درمیان اٹھتا ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کے اندر غیر معمولی جوش و خروش اور ہیجان کی کیفیت دکھائی دینے لگے تو گذشتہ تاریخ کی روشنی میں، اس مسئلہ کے انجام سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ اور اکثر اوقات اس مسئلہ کے انجام کے بارے میں بدترین اندیشے درست ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں تک غور و فکر اور پہلے سے مرتب کی پروگرام کے تحت کسی جد و جہد یا تحریک کو آگے بڑھانے کے اصول اور عادت کا تعلق ہے تو اس میں کچھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہی تخصیص نہیں، سارے عالم اسلام میں اس معاملہ میں صورت حال یکساں ہی نظر آتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بین اسلام ازم کی تحریک کی ناکامی سے لے کر جس نے ایک زمانہ میں پورے عالم اسلام کو جوش و خروش کے بے نظیر جذبات سے سرشار کر دیا تھا، عرب قومیت کی اس تحریک تک، جس کے نتیجہ میں مرکز اسلام خلافت کی رہی سہی اور کمزور عمارت آخر کار منہدم کر دی گئی، مسلمانوں کی متلون مزاجی اور غور و تدبیر سے خالی پر جوش سرگرمیوں کے ثبوت نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں عالم عرب کے عین قلب اسرا

حکومت کے قیام کے بعد تو مسلمانوں کے ذہنی انتشار کا عالم کچھ اس طرح سامنے آیا ہے کہ اس کی کوئی تاویل اور معذرت ممکن ہی نہیں رہی ہے۔ اس بدیہی نتیجہ کی موجودگی میں عربوں کے لیے خصوصاً تمام دنیا کے لیے عموماً اسرائیل کے وجود سے نجات پانے کا مقصد، ایک اجتماعی اور ملی نصب العین کی حیثیت اختیار کر گیا ہو۔ اسرائیلی حکومت کا نہ صرف جوں کا توں قائم رہنا بلکہ یہ سلطنت قوت اور استحکام کے لحاظ سے مضبوط سے مضبوط تر اور خطرناک سے خطرناک تر ہوتی چلی گئی اس کے بجائے عربوں کی باہمی مناقشت، خود فلسطینی تنظیم کی خانہ جنگی، اور خوں ریز گروہ بندی اور مسلمانوں کی باہمی پیکار کی کیفیت پانچ سال سے جاری عراق ایران جنگ کی صورت میں بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان میں جہاں معلوم اسباب، اور نفسیاتی پس منظر کی بدولت، پیچیدہ تر، سخت تر، اور دشوار تر مسائل کا سامنا ہے، ہر کام کو غور و فکر اور انجام کو سوچے بغیر شروع کر دینے کی عادت بھی زیادہ بری صورت میں پائی جاتی ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں میں کتنے ہی ایسے محاذوں سے بے نیل و مرام واپس لوٹنا اور پسپا ہونا پڑا ہے، جن پر انھیں ابتدا میں شاندار کامیابیوں کا یقین تھا، اور پیش قدمی کے ابتدائی، ہیجانی اور جذباتی دور میں مسلم رہنماؤں سے لے کر مسلم عوام تک اُس فتح و کامرانی کے نشہ میں چور نظر آتے تھے۔ اس صورت حال کی مثال کے طور پر، آزادی سے پہلے کی تحریک خلافت، اور آزادی کے بعد مسلم مجلس مشاورت کے عروج کی داستانیں پیش کی جا سکتی ہیں، جن کی چہل پہل، ہنگامہ خیزی، اور نقل و حرکت کا غلغلہ ایک زمانہ میں زمین سے لے کر آسمان تک پہنچتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن دونوں تحریکیں

کا انجام ایسی مایوسی اور ناکامی کی صورت میں برآمد ہو کہ اس کے نفسیاتی رد عمل میں مسلمانوں کی قوت حس اور اعصاب اس بُری طرح متاثر ہوئے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے دلی اور صدمہ کی کیفیات مسلم سماج میں مستقل ہو کر رہ گئیں۔ اور بے عملی اور تقدیر پر راضی برضا ہو کر بیٹھ جانے کا رجحان پوری اجتماعیت پر مسلط اور غالب نظر آنے لگا۔

بین الاقوامی سطح پر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی اخوت کو عام کرنے اور اختلاف کو ختم کر کے باہمی طور پر مشترکہ دشمنوں کے مقابلہ میں متحد ہونے کا نعرہ مسلم ممالک اور مسلم سربراہوں کا ایک مرغوب نعرہ ہے، لیکن اس نعرہ کے تحت، جب وہ مشترکہ مسائل پر کسی مشترکہ فیصلے پر پہنچنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو اتحاد کے بجائے اختلاف ہی ان کے فیصلوں پر غالب رہتا ہے۔ اور یہ اجتماعیات خواہ اسلامی کانفرنس کے تحت ہوں، یا عرب لیگ کے تحت ہوں، یا اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ادارہ کے اسٹیج پر ہوں، مسلم ممالک کے سربراہوں اور مختلف خیالات ونظریات کے خانوں میں بٹی ہوئی ملت کے اختلاف اور باہمی آویزش کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں، جو ان کے دشمنوں کے سوا کسی کو خوش اور مطمئن کرنے کے کام نہیں آسکتی۔ بالکل یہی صورت ہندوستان میں ملکی سطح پر دیکھنے کو ملتی رہتی ہے، جہاں اتحاد، اشتراک اور باہمی تعاون کے نعروں کے پیچھے مختلف مسلم تنظیموں کے سربراہ اپنی جماعتی مصلحتوں اور شخصی مفادات کو آگے بڑھانے کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ بڑے سے بڑے اجتماعی نقصان کا خوف بھی اس عادت کو ترک کے سلسلے میں ان پر مؤثر ثابت نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے، اتحاد کے نام پر منعقد ہونے والے اجتماعات، مفادات کی کشمکش کا دنگل بن جاتے ہیں، اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے مطلوبہ قوت، باہمی آویزش میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اور نتیجہ، نشستند وگفتند وبرخاستند سے زیادہ اور کچھ نہیں نکلتا۔

ایسا نہیں ہے کہ موجودہ مسلم رہنماؤں کے اندر دانش مندی، سمجھداری اور عاقبت اندیشی کے خصائص کا بالکل ہی قحط پڑ گیا ہو، درجنوں ایسے رہنما ہیں، جن کی ذاتی اہلیت، قابلیت صلاحیت اور خوش تدبیری کی خصوصیتوں کے بارے میں شک و شبہہ کی گنجائش ہی بظاہر دکھائی نہیں دیتی، ان کی شخصی وجاہتوں اور قوت عمل کے بارے میں بھی کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، وہ الگ الگ اور انفرادی حیثیت میں بڑے معقول، مسائل کی اہمیت، اور سنگینی سے پورے طور پر واقف، اور ملی دردمندی اور مستقبل کی فکر اور احساس سے بھی مکمل طور پر بہرہ ور دکھائی دیتے ہیں، مسائل کے بارے میں ان کی رائے اور انھیں حل کرنے کی ضرورت کے سلسلے میں ان کے خیالات بھی قابل قدر محسوس ہوتے ہیں لیکن یہی لوگ جب ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتماعی طور پر غور و فکر کرنے کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کی صلابت رائے، عاقبت اندیشی کی خصوصیت اور اہلیت و قابلیت نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے کیوں کہ ان کے اجتماعی فیصلوں میں ان خصوصیات کا کوئی پرتو دکھائی نہیں دیتا، بلکہ ان کے غیر معقولیت اور ناقابل عمل ہونے کا تاثر اس درجہ نمایاں ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجہ کی عقل و فہم رکھنے والا آدمی کو بھی، آسانی کے ساتھ ان کے فیصلوں کی غیر معقولیت کو محسوس کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ یہ لوگ قابلیت، صلاحیت، تدبر، عقل و فہم، اور عاقبت اندیشی کی تمام تر خوبیوں سے متصف ہونے کے باوجود، جماعتی مصلحتوں اور شخصی مفاد سے اوپر اٹھ کر معاملات کو دیکھنے پر کسی طرح تیار نہیں ہوتے اور اس ذاتی اور جماعتی اغراض کے ہجوم میں اس بنیادی حقیقت کو مکمل طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اتحاد میں سب طاقتور ہوتے ہیں، اور اختلاف سب کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس اصول کو نظر انداز کرنے کا ہی نتیجہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی ملک گیر قیادت پورے طور پر ختم ہو گئی ہے اور تمام مسلم رہنما فوج سے محروم جنرلوں کی حیثیت میں آگئے ہیں۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی عادت کا بالآخر یہی انجام ہوتا ہے کہ سب ہی لوگ منہ کے بل زمین پر آرہے ہیں۔

اس افسوسناک رجحان اور بُری عادت کی ایک تازہ مثال شاہ بانو مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف مسلم پرسنل لار بورڈ کی طرف سے تحریک تحفظ شریعت کے سلسلے میں سامنے آئی ہے، جس کی بدولت مسلمانوں میں بہت دنوں کے بعد بیداری اور عزم وہمت کے آثار دکھائی دیے اور ملک کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک، ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے ہجوم سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف احتجاج اور مسلم پرسنل لار کے تحفظ کے مطالبے کے ساتھ سڑکوں اور پبلک مقامات پر نظر آنے لگے، اور عوامی سطح پر اتحاد و اشتراک اور ہمنوائی کے ایسے زبردست مظاہرے سامنے آئے جنھیں کم از کم الفاظ میں، بے مثال اور بے نظیر ہی کہا جاسکتا ہے، ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے اس اتحاد و اتفاق کے مظاہروں سے حکومت اور حکمراں جماعت کے رہناؤں کا متاثر ہونا لازمی تھا، اس لیے وہ متاثر ہوئے یہاں تک کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ اتنے بڑے پیمانہ پر اقلیتوں کی طرف سے بے اطمینانی اور اضطراب کے مظاہرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان کی حکومت یقیناً مسلمانوں کی شکایت پر غور کر کے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن لاکھوں کے یہ مجمعے اور ان کے نمایاں سیاسی نتائج کے اثرات خود مسلمانوں کی صفوں پر کس طرح مرتب ہوئے، اس کا اندازہ، ان بے شمار طالع آزما لوگوں کی سرگرمیوں سے ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کے اس جوش و اضطراب سے فائدہ اٹھانے کے لیے نکل پڑے اور انھوں نے مسلم پرسنل لار بورڈ سے الگ ہو کر، سپریم کورٹ کے فیصلے پر مسلمانوں کے اضطراب اور ان کے اجتماعات کو شخصی طور پر اپنے اثرات کے حلقے بنانے کے لیے اس طرح استعمال کرنا شروع کر دیا کہ تحفظ شریعت کے نعرے پر کتنی ہی متوازی تنظیمیں دیکھتے ہی دیکھتے، سرگرم عمل نظر آنے لگیں، یہاں تک کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لار بورڈ کے مقابل ایک مسلم پرسنل لار کانفرنس بھی بن گئی اور اس کے رہناؤں نے مسلمانوں کی زیادہ زیادہ حمایت کرنے کی غرض سے ایجی ٹیشن اور بھوک ہڑتال کے

بھی نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اور اس طرح حسب عادت ایک ایسی تحریک کے بھی اختلاف و انتشار سے دوچار ہونے کا خطرہ پیدا کر دیا جس نے بہت دنوں کے بعد یک جہتی اور اتحاد کی حقیقی صورت حال مسلمانوں میں ابھاری تھی۔

زیادہ تشویش اور خطرے کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسے رہنماؤں کی تعداد تیزی کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے، جو اپنے خلوص اور شخصی اثرات کے لحاظ سے سبھی جماعتوں اور جماعتی رہنماؤں کے نزدیک قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے، اور عظمت و اثرات کے ایسے بلند مقامات پر فائز تھے کہ ان کی موجودگی میں اختلافات اور باہمی آویزش پیدا بھی ہوتی تھی تو کھلی پیکار اور تصادم میں تبدیل نہیں ہونے پاتی تھی۔ اس موقعے پر ہمیں بے ساختہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی یاد آتی ہے، جنھوں نے آزادی کے بعد کی پوری مدت میں، مسلمانوں کی مختلف تنظیموں اور رہنماؤں کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کی جدوجہد کے ذریعہ، کسی نہ کسی طرح اتحاد و اتفاق کی فضا کو قائم رکھا۔ مفتی صاحبؒ کی کسی اجتماع میں موجودگی ہی اس بات کی ضمانت سمجھی جاتی تھی کہ اگر اتفاق اور اتحاد کی حقیقی فضا پیدا نہ ہو سکی تو وہ اجتماع اختلاف اور تصادم کے نقصان سے بہرحال محفوظ رہے گا۔ ان کے بعد ایسی کوئی مؤثر شخصیت مسلمانوں کے درمیان باقی نہیں رہتی جو ظاہری طور پر ہی سہی، مسلم تنظیموں اور مسلم رہنماؤں کو رشتۂ اتحاد میں بندھے رہنے پر مجبور کر دے۔ اور یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت موجود نہیں۔